ایمان کا موضوع

(گزشتہ سے پیوستہ)

مرتب : ابو عبدالرحمٰن شبیر بن نور

ان سوالات کے جوابات تاریخ انسانی میں دو طریقوں سے پیش کئے گئے۔ ایک طریقہ وہ ہے جو حکماء اور فلاسفہ نے اختیار کیا۔ انہوں نے عقل و منطق کے گھوڑے دوڑائے۔ حواس کے ذریعے جو معلومات انہیں حاصل ہو گئیں 'عقل کی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان سے نظریات مدوّن کئے۔ مثلاً حقیقت کے بارے میں مختلف نظریات جن میں تصوریت (Idealism) اور مادیت (Materialism) نمایاں ہیں' وجود میں آئے۔ فلسفے کے بارے میں یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ اس میں یقین نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔ ہر بات کی بنیاد ظن 'تخمین 'گمان' اندازے اور قیاس پر ہوتی ہے۔ فلسفی حضرات اپنے نظریات کو بالعموم اس قسم کے پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ "ہمیں یوں محسوس ہوتا ہے" یا یہ کہ "ہمارا یہ خیال ہے" وغیرہ۔ اور جو کوئی جتنا بڑا فلسفی ہو گا اسی قدر وہ اپنے نظریات کو عاجزانہ انداز میں پیش کرے گا۔

اس کی ایک نمایاں مثال خود علامہ اقبال ہیں۔ انہوں نے اپنے خطبات (یعنی "تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ") کے مقدمہ میں تسلیم کیا ہے کہ "میں یہ نہیں کہتا کہ میں جو کچھ کہتا ہوں وہ حرف آخر ہے' ہمارا کام ہے کہ علمی رویئے کو برقرار رکھتے ہوئے غور و فکر کو آگے بڑھائیں' ہو سکتا ہے کہ ان خطبات میں جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ان سے بڑھ کر اور بہتر خیالات سامنے آ جائیں"۔ حکیم الامت جیسا عظیم فلسفی بھی اپنے فلسفیانہ افکار و خیالات کو اس عاجزی اور انکساری کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ میرا ہرگز یہ دعویٰ نہیں ہے کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ حرفِ آخر ہے۔ البتہ دنیا میں بڑے بڑے فلسفے موجود

ہیں جنہوں نے ایک عالم کو مسخر کر رکھا ہے۔ ان کی تاثیر اور اثر پذیری سے انکار ممکن نہیں۔ یہاں تک کہ بعض مذاہب کو بھی فلسفیانہ مذاہب (Philosophical Religions) کا نام دیا جاتا ہے۔ ان کی بنیاد وحی کے بجائے فلسفہ ہے۔

لیکن تاریخ انسانی میں ان سوالات کا دوسرا جواب کچھ لوگ اس دعوے سے دیتے ہیں کہ ہمیں ایک خاص ذریعے (Source) سے علم حاصل ہوا' یعنی نہ تو یہ ہمارا اپنا ذاتی خیال ہے' نہ ہی منطق صغریٰ کبریٰ ملا کر ہم نے کوئی نتیجہ نکالا ہے اور نہ ہی یہ ہمارے غور و فکر کا حاصل ہے بلکہ یہ وحی آسمانی ہے : ﴿اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى﴾[۱] ____ وحی کی بنیاد پر علم کا دعویٰ کرنے والوں نے کہا کہ صرف یہی حق ہے اور اس کی حقانیت میں کسی شک و شبہ کی بھی گنجائش نہیں۔ فرمایا : ﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ﴾[۲] یہ دعویٰ ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ کسی بھی فلسفی نے یہ بات کبھی نہیں کہی' اگر کہی تو صرف اللہ کے رسول اور نبی نے کہی اور وہ یہ بات اپنے اپنے وقت میں بڑے دعوے کے ساتھ کہتے رہے۔ مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے والد کو مخاطب کرکے فرمایا :

﴿يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ○﴾ (مریم : ۴۳)

"ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا تھا' پس آپ میری پیروی کیجئے' میں آپ کو سیدھا راستہ بتاؤں گا!"

تجرباتی علم باپ کے پاس زیادہ تھا کیونکہ اس کی عمر زیادہ تھی' اس کا تجربہ بیٹے کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا' وہ کہہ سکتا تھا کہ تم کل کے بچے ہو' میں نے اپنے بال دھوپ میں سفید نہیں کئے ہیں' تم مجھے کہہ رہے ہو کہ میری پیروی کرو! کس بنیاد پر؟ آخر کوئی بنیاد تو ہونی چاہئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں جو دلیل پیش فرمائی وہ لائق توجہ ہے۔ فرمایا : "ابا جان! میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا"۔

{۱} سورۃ النجم آیت نمبر ۴' "یہ تو ایک وحی کی تعلیم ہے جو اس پر نازل کی جاتی ہے"۔

{۲} سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲' "یہ الکتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں"۔

اس علم تک تمام انسانوں کی رسائی ممکن نہیں۔ یہ ذریعۂ علم کچھ اور ہی ہے۔ حواس یا عقل کو اس کا منبع یا سرچشمہ قرار نہیں دیا جا سکتا' بلکہ اس کا ذریعہ اور سرچشمہ (Source) وحی ہے۔ اسی لئے اس کے بارے میں صاف فرما دیا گیا کہ : "اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی"۔ چنانچہ اس علم کی بنیاد پر انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والتسلیم ہر دور میں اپنی قوم سے یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ہماری پیروی کرو' ہمارا اتباع کرو۔

حقیقتِ مطلقہ کے بارے میں ان سوالات کے جوابات کی چار سطحیں ممکن ہیں' اس لئے کہ لوگوں کے عقل و شعور کی سطحیں (Levels of Consciousness) بھی مختلف ہوا کرتی ہیں۔ علم' فہم اور شعور کے اعتبار سے تمام انسان چونکہ ایک سطح پر نہیں ہیں لہٰذا وحیِ الٰہی کے ذریعے ملنے والے جوابات کی بھی چار سطحیں ہیں۔

پہلی سطح کو عام فہم سطح کا نام دیا جا سکتا ہے۔ قرآن حکیم اور حدیثِ رسول اکرم ﷺ نے بنیادی طور پر اسی سطح پر گفتگو کی ہے' کیونکہ قرآن : "هُدًى لِّلنَّاسِ" ہے۔ ظاہر بات ہے کہ "النّاس" میں اَن پڑھ' کاشتکار اور مزدور قسم کے لوگ بھی شامل ہیں۔ اس سطح کو ایک عالم اور فلسفی سے لے کر عام آدمی تک ہر انسان سمجھتا ہے' حتیٰ کہ صحرا میں بسنے والے بدّو اور چرواہے بھی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ قرآن حکیم میں اونچے فلسفیانہ حقائق نہیں ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اعلیٰ فلسفیانہ مضامین قرآن حکیم میں بالعموم ضمنی طور پر آتے اور مخفی انداز میں بیان ہوتے ہیں۔ ایک حکیم اور فلسفی اس مقام پر ڈیرہ ڈال لیتا ہے' جبکہ عام انسان ان سے سرسری طور پر گزر جاتا ہے۔ عافیت بھی اسی میں ہے کہ عام انسان سرسری ہی گزر جائے۔ واضح رہے کہ ان دقیق معانی کے بغیر بھی رشد و ہدایت کا مدعا پورا ہو رہا ہوتا ہے ____ میں نے "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" نامی کتابچے میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے کہ ایک ہے "تذکّر بالقرآن" اور ایک ہے "تدبّرِ قرآن"۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مثلاً اگر تیل سمندر میں گر جائے تو وہ پانی کی سطح پر ایک باریک تہہ کی صورت میں پھیل جاتا ہے' نیچے نہیں جاتا۔ یوں سمجھئے کہ قرآن کی ہدایت کا لبِّ لباب اس کی اوپر والی سطح پر موجود ہے۔ اس سے یہ غلط فہمی بھی نہ ہو کہ قرآن حکیم کی ساری تعلیم بس یہی کچھ ہے' بلکہ اس کی گہرائی تو ناپی ہی

نہیں جاسکتی۔ اس کی عام تعلیمات اس تیل کی مانند ہیں جو سمندر کے اوپر نظر آرہا ہے جبکہ یہ خود سمندر سے زیادہ گہرا ہے۔ چنانچہ ان سوالات کا ایک جواب عام فہم سطح کا ہے۔ قرآن و حدیث نے بطرزِ جلی اسی کو اختیار کیا ہے۔

دوسری سطح کو ہم متکلمانہ سطح کہہ سکتے ہے۔ یعنی ذات و صفاتِ باری تعالیٰ اور ماورائی حقائق کو عقل و منطق کے حوالے سے سمجھنا۔ اس متکلمانہ سطح کے ہمارے ہاں تین گروپ پیدا ہوئے ہیں۔ اشاعرہ، ماتریدیہ اور معتزلہ۔ اشاعرہ ایک انتہا پر ہیں تو معتزلہ دوسری پر۔ معتزلہ انتہائی عقلیت پسند (Rationalist) ہی نہیں عقلیت پرست بھی ہیں۔ اشاعرہ اس کے برعکس، اور ماتریدی درمیان میں ہیں۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے عقائد کو مرتب کیا ہے۔ عقائد کی جو کتابیں ہیں وہ درحقیقت ان ایمانی حقائق کی منطقی تعبیرات ہیں۔ یہی لوگ اپنے دور میں علم و منطق کو جاننے والے تھے۔ انہوں نے ان حقائق کی تعبیر کی ہے۔ البتہ ان لوگوں کے بیان کردہ حقائق ہرگز حرفِ آخر نہیں ہیں۔ عقائد یا عقیدہ کا لفظ بھی قرآن یا حدیث کی اصطلاح نہیں ہے، یہ علمِ کلام کی اصطلاح ہے۔ اس اصطلاح کا آغاز بعد میں ہوا۔

ان سوالات کے جوابات کی تیسری سطح فلسفیانہ ہے۔ ہمارے ہاں ابن سینا، فارابی اور ابن رشد نے خالص فلسفہ کی بنیاد پر دینی حقائق کی تعبیریں کی ہیں جبکہ متکلمین اسلام نے فلسفہ کو کتاب و سنت کے ساتھ جوڑنے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

اس سلسلے کی چوتھی سطح وہ ہے جسے ہم صوفیانہ سطح کا عنوان دے سکتے ہیں۔ گہرائی کے اعتبار سے صوفیاء کے تصورات سب سے گہری سطح پر ہیں۔ انہوں نے حقائق کی تعبیر وجدانی کیفیت کے ساتھ یعنی علم بالقلب کے ذریعے کی ہے۔ گویا کہ صوفیاء نے علمِ کلام یا فلسفہ کی بجائے وجدانی قوتوں کو بروئے کار لا کر اپنی باطنی کیفیات کے حوالے سے ان حقائق کا ادراک کیا ہے۔

یہ چار سطحیں ہیں، لیکن ہماری گفتگو بنیادی اور پہلی سطح یعنی عام فہم سطح کے حوالے سے ہوگی۔ البتہ کہیں کہیں تعبیرات کے ضمن میں متکلمانہ، فلسفیانہ اور صوفیانہ سطحوں کا حوالہ بھی آئے گا۔ ایمان، قرآن و حدیث کی اصطلاح ہے، چنانچہ ان سوالات کے جوابات

کے ضمن میں ہماری گفتگو بھی قرآن وحدیث کے اردگرد رہے گی۔

س نمبر ا : کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

ج : یہ کائنات نہ ہمیشہ سے ہے اور نہ ہمیشہ رہے گی۔ یہ ایک خاص وقت تک کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اللہ تعالٰی نے فرمایا :

﴿مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَابَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى﴾ (الروم : ۸' اور اسی معنی میں الاحقاف : ۳)

"اللہ نے آسمانوں اور زمین کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدتِ مقرر کے لئے ہی پیدا کیا ہے۔"

البتہ ایک ہستی ایسی ہے جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ ہمیشہ رہنے والی ہستی خالق ہے اور فنا ہونے والی مخلوق ہے۔ اسی ہستی نے ساری کائنات کو پیدا فرمایا۔ اللہ تعالٰی کا فرمان ہے :

﴿خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَصَوَّرَكُمْ فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝﴾ (التغابن : ۳)

"اس نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے اور تمہاری صورت بنائی اور بڑی عمدہ صورت بنائی ہے۔ اور اسی کی طرف آخر کار تمہیں پلٹنا ہے"۔

اس خالق ذات کو تم اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر یاد کرو' بات ایک ہی ہے۔ اللہ تعالٰی نے فرمایا :

﴿قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ۭ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى﴾ (بنی اسرائیل : ۱۱۰)

"(اے نبی ان سے) کہو اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر' جس نام سے بھی پکارو اس کے لئے سب اچھے ہی نام ہیں"۔

اس کی ہستی تنہا ہے' از خود اور باخود ہے' نہ اس کے والدین ہیں نہ اولاد اور نہ بیوی۔ وہ بالکل تنہا ہے' نہ اس کا کوئی مثل ہے' نہ مثیل ہے نہ مثال' نہ ضِد ہے اور نہ نِد (مقابلے کا فرد)۔ اس کا کفو' ہمسر اور ندِ مقابل کوئی ہے ہی نہیں۔ اس ضمن میں آخری بات اس

آیت کریمہ میں فرمادی گئی :

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ : ۱۱)

"نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی"۔

دوسری جگہ فرمایا :

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌO اَللّٰهُ الصَّمَدُO لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْO وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌO﴾ (سورۃ الاخلاص)

"کہو : وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے' اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

وہ ہستی ہر ضعف' ہر عیب اور ہر احتیاج سے اعلیٰ وارفع ہے' مبرا اور منزّہ ہے۔ گویا کہ ہر اعتبار سے کامل ہستی اور سُبّوح وقدوس ذات ہے۔ جس اعلیٰ واشرف صفت یا قدر کا بھی تصور کیا جاسکتا ہے' اللہ تعالیٰ اس صفت سے بتمام وکمال متّصف ہے۔ مثلاً زندگی ایک اعلیٰ قدر ہے تو اللہ تعالیٰ "اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ" ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس کی زندگی مستعار نہیں' بلکہ اس کی ذاتی ہے۔ وہ ساری کائنات کو اپنی کمال قدرت سے تھامے ہوئے ہے۔ اسی طرح علم ایک اعلیٰ قدر ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ "بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" ہے' ہر چیز کا پوری طرح اور ہمیشہ سے علم رکھنے والا ہے۔ قدرت ایک اعلیٰ قدر ہے اور اس کی ذات "عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" ہے' وہ اپنے علم اور قدرت کے ساتھ ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے۔

اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں' اس کی صفات میں کوئی شامل نہیں' اس کے حقوق میں کوئی ہمسر اور ساجھی نہیں۔ اس کے جملہ حقوق ایک لفظ "عبادت" میں آ جائیں گے۔ بقول شاعر ؎

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق!

لہٰذا عبادت صرف اور صرف اسی کی کی جائے گی خواہ وہ انفرادی عبادت ہو یا اجتماعی عبادت' یعنی ایک فرد کے ذاتی معاملات سے لے کر پوری قوم اور ملت کے اجتماعی

آیت کریمہ میں فرمادی گئی :

﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ (الشوریٰ : ۱۱)

"نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی"۔

دوسری جگہ فرمایا :

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۝ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ۝﴾ (سورۃ الاخلاص)

"کہو : وہ اللہ یکتا ہے۔ اللہ سب سے بے نیاز ہے اور سب اس کے محتاج ہیں۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے' اور نہ وہ کسی کی اولاد۔ اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔"

وہ ہستی ہر ضعف' ہر عیب اور ہر احتیاج سے اعلیٰ وارفع ہے' مبرا اور منزّہ ہے۔ گویا کہ ہر اعتبار سے کامل ہستی اور سُبّوح وقدوس ذات ہے۔ جس اعلیٰ واشرف صفت یا قدر کا بھی تصور کیا جاسکتا ہے' اللہ تعالیٰ اس صفت سے بتمام وکمال متصف ہے۔ مثلاً زندگی ایک اعلیٰ قدر ہے تو اللہ تعالیٰ "اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ" ہے۔ وہ زندہ ہے اور اس کی زندگی مستعار نہیں' بلکہ اس کی ذاتی ہے۔ وہ ساری کائنات کو اپنی کمال قدرت سے تھامے ہوئے ہے۔ اسی طرح علم ایک اعلیٰ قدر ہے اور اللہ تعالیٰ کی شان یہ ہے کہ وہ "بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ" ہے' ہر چیز کا پوری طرح اور ہمیشہ سے علم رکھنے والا ہے۔ قدرت ایک اعلیٰ قدر ہے اور اس کی ذات "عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ" ہے' وہ اپنے علم اور قدرت کے ساتھ ہر جگہ اور ہر آن موجود ہے۔

اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں' اس کی صفات میں کوئی شامل نہیں' اس کے حقوق میں کوئی ہمسر اور ساجھی نہیں۔ اس کے جملہ حقوق ایک لفظ "عبادت" میں آ جائیں گے۔ بقول شاعر ؂

وہی ذاتِ واحد عبادت کے لائق
زبان اور دل کی شہادت کے لائق!

لہٰذا عبادت صرف اور صرف اسی کی کی جائے گی خواہ وہ انفرادی عبادت ہو یا اجتماعی عبادت' یعنی ایک فرد کے ذاتی معاملات سے لے کر پوری قوم اور ملت کے اجتماعی

معاملات اور نظامِ حکومت و حکمرانی تک اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی اور اسی کا حکم چلنا چاہئے۔ فرمایا : "اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ" {۳} نیز فرمایا "اَلَا لَہُ الۡخَلۡقُ وَالۡاَمۡرُ" {۴} یعنی خلق بھی اس کی ہے اور امر بھی اس کا ہے اور حکم بھی اسی کا چلے گا۔ اور اس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں۔ فرمایا : "وَلَا یُشۡرِکُ فِیۡ حُکۡمِہٖۤ اَحَدًا" {۵} وہ اپنے اختیارِ حکم و حکمرانی میں کسی دوسرے کو شریک کرنے کے لئے تیار نہیں۔

ان سب چیزوں کو جمع کر کے ترتیب دے لیں تو اس کا نام ایمان باللہ یا توحید ہے۔ فلسفیانہ اور منطقی انداز میں کہیں گے کہ خالق کی ذات واجب الوجود ہے اور ساری مخلوق یعنی ساری کائنات ممکن الوجود۔ اور یہ کلیہ طے ہے کہ ممکن الوجود اپنی حقیقت اور اصل کے اعتبار سے معدوم کے درجے میں ہوتا ہے ع ہرچند کہیں کہ ہے، نہیں ہے!
اور بقول غالب ؎

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے!

مزید گہرائی میں جایئے تو صوفیاء تو یہ کہہ دیتے ہیں کہ وجودِ حقیقی صرف اس کا ہے، باقی جو کچھ نظر آ رہا ہے، وہمی ہے، خیالی ہے ؎

کلُّ ما فی الکونِ وھمٌ او خَیال
او عکوسٌ فِی المرایا او ظِلال

یعنی ساری کائنات سایہ یا عکس ہے، یا وہم و خیال کی بات ہے۔ گویا کہ وجودِ حقیقی صرف اسی ذات کا ہے۔ آپ اسے وحدت الوجود کے اعتبار سے تعبیر کیجئے یا وحدت الشہود کے اعتبار سے، یہ ایک ہی ہستی کا بیان ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کا قول اس ضمن میں بالکل فیصل ہے، جس کا میں قائل ہوں، کہ ان دونوں میں تعبیر ہی کا بال برابر فرق ہے، کوئی حقیقی فرق نہیں ہے۔

{۳} سورۃ الانعام آیت ۵۷ و سورۃ یوسف آیت ۴۰ اور ۶۷
{۴} سورۃ الاعراف آیت ۵۴
{۵} سورۃ الکہف آیت ۲۶